

Received: 11th Aug, 2024 | Accepted: 15th Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.405

معاصر بلوچستانی اردو نظم کا اساطیری اور داستانی رنگ Mythological and Fictional Color of Contemporary Urdu Poem of Baluchistan

DR. QANDEEL BADAR

Assistant Professor, Department of Urdu, Sardar Bahadur Khan Women's University Quetta, Pakistan
(qndil78@gmail.com)

ABSTRACT After the formation of language, the first link of human mind and civilization is the establishment of mythology. It would not be wrong if mythology is said to be the oldest form of literature in the world. Mythological style of expression is closely related to the genre of poem.

In Urdu poem, the mythological and fictional color was present in different forms from the beginning, which started to be more refined after 60s. In this period, a world of mythological symbols, religious and folk allusions got settled in the poem which expanded its scope of meanings.

The post 21st century poems have succeeded in creating a distinct identity due to their mythological atmosphere. Contemporary Baluchistan poetry has created a special way of creating new myths by grasping the atmosphere and linguistic system of mythology.

Mythology appears to be used in many forms in the poem of Baluchistan, either retelling of mythological stories through which many new meanings are created, or an event or character from an old myth with new features, is described. While in the third case, on the basis of different myths or by grasping the mythological atmosphere and language, new myth is fabricated. This third case is the most desirable for the current poem. In the tribal poetry of Baluchistan, all mythological elements and fictional style have been present with their full essence from the beginning. By adding all the characteristics of the present complex prospect to this essence, the leaven of contemporary Baluchistan Urdu poetry has been created. This paper is based on this specific study of poem.

Key words: Baluchistan, Urdu Poem. Mythology, Fiction, Tribal Poetry, Folklore, Allusion, Symbol, Contemporary, Prospect, Characteristics.

اساطیر سے متعلق دست یاب معلومات اور مباحث کی ذیل میں ماہر نفسیات سگنڈ فرائیڈ، کارل ڈونگ، اور لیوی اسٹر اس کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں صرف ڈونگ کی تحقیقی محنت کے حوالے سے سہیل احمد خان کی یہ رائے ملاحظہ کیجیے:

"ڈونگ نے ایک اندازے کے مطابق تقریباً سڑ سڑ ہزار خوابوں کا تجزیہ کیا۔ ان خوابوں کی مثالوں کے ذریعے سے وہ ان اساطیری وضعوں تک پہنچا جو دنیا بھر کی لوک کہانیوں، حکایات اور اساطیر میں ملتی ہیں۔ ان کے آفاقی ہونے کا مطلب یہی ہے کہ یہ



This work is licensed under a [Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License \(CC BY-NC 4.0\)](https://creativecommons.org/licenses/by-nc/4.0/)



لاشعور کی ترجمان ہیں۔" (۱)

کارل ٹرونگ تمام تخلیقی فنون کو دو کیفیات کا محتاج بتاتا ہے جو اس کے لیے خوراک اکٹھا کرتی ہیں۔ جنہیں وہ نفسی اور غیبی کیفیت کا نام دیتا ہے۔ نفسی شعور جب کہ غیبی لاشعور کی پروردہ ہے جسے وہ انسان کے اجتماعی لاشعور سے جوڑتا ہے۔ انسان کا یہ اجتماعی لاشعور زبان کی صورت منتقل ہوتا رہا ہے۔ زبان اس کے مطابق اولین انسانی تخیل جسے آرکی ٹائپل تصور کہا جاتا ہے، کی نمائندہ ہے، جس میں واضح مفہم موجود نہیں لیکن یہ درحقیقت مفہم کی آماج گاہ ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی کی تند و تیز بے رحم لہروں نے آرکی ٹائپ تصورات جو زمانی پینڈے میں کہیں بے حس و حرکت پڑے تھے، کو جھنجھوڑ کر پھر سے سطح پر نمودار کر دیا ہے۔ معاصر نظم کا گہرا مطالعہ اس امر کا نماز ہے کہ یہی تصورات اس کی عصری صورت گری کرنے میں عمل انگیز کی طرح کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد رقم کے یہ قول:

"اساطیر کا تعلق اگرچہ ماضی سے ہوتا ہے لیکن اگر غور کریں تو یہ انسان کے حال میں زندہ ہوتی ہیں کیوں کہ یہ انسان کے عقیدے سے متعلق ہوتی ہیں۔ مستقبل کی اساطیر وہ ہیں جو حال میں جنم لے رہی ہیں۔ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ سائنس و شعور کے زمانے میں یہ میراث کو کہانیاں کیا جواز رکھتی ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، آج بھی اساطیر بن رہی ہیں۔ انسان کے ذہن کو اس نوع کی کہانی کے ساتھ کوئی ازلی نسبت ہے۔"

(۲)

زبان کی تشکیل کے بعد انسانی ذہنی ارتقا اور تہذیبی بنیاد کی پہلی اینٹ اساطیر کا وجود میں آنا ہے۔ اساطیر لفظ اسطوره سے مشتق ہے اس عربی لفظ کے معنی افسانہ، کہانی یا لغویات کے ہیں۔ اسطوره، انگریزی لفظ myth (جو یونانی لفظ mythos) سے ماخوذ ہے، کے متبادل کے طور پر اردو میں رائج ہوا جس سے مراد زبانی ادا کیے گئے الفاظ ہیں۔ یعنی اصطلاح کے مطابق اساطیر وہ قصے تھے جو قصہ گو زبانی سنایا کرتے تھے۔ درحقیقت اساطیر دنیا بھر میں ادب کی قدیم ترین شکل ہے۔ ابتدائی طور پر انسان نے کائنات اور اس میں مقیم تمام موجودات سے متعلق جو بھی خیال آرائیاں کیں، اساطیر نے انھیں سے جنم لیا۔ لیکن تاحال اساطیر کے مفہم سے مباحثہ آگاہی نہیں ہو سکی جس کی کئی وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ اساطیر کو سمجھنے کی راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ یہ کہانیاں ایک دوسرے سے گہری مماثلت رکھتی ہیں، ایک کہانی کو سمجھنے کے لیے کئی کہانیوں میں سفر کرنا پڑے گا۔ ان کہانیوں کا ایک اپنا علامتی نظام ہے بالکل اسی طرح جیسے مشرقی غزل کی روایت سے ناواقفیت، غزل کی شعر سے مکمل لطف لینے کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اساطیر کے معنی تک بھی ان کے مجموعی مطالعے ہی سے رسائی ممکن ہے۔ دوسرا اہم مرکزہ ثقافتی نشانات ہیں جن کی تنہیم کے بغیر اساطیر کے مکمل مفہم ہاتھ نہیں آسکتے۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ ان ابہام کے باوجود ہم اساطیر میں چھپے معنی سے رجوع کر پاتے ہیں۔ ماہرین اس کی وجہ بنیادی انسانی ذہن میں موجود اکائی یا یکسانیت کو قرار دیتے ہیں۔ انسان کا اولین احساساتی اور کائناتی نظام سے متعلق سادہ منطقی اظہار اساطیر ہی ہیں۔ موجودہ تحقیق تک اس سے قبل کے اظہار بے وجود نہیں رکھتے۔ یہ رسم الخط کی ایجاد سے بھی بہت پہلے کے ماخذات ہیں۔ لیکن ان میں ابتدائی

انسان کے تہذیبی اور ذہنی سفر کی مکمل کہانیاں محفوظ ہو چکی ہیں۔ اساطیری کہانیوں کا سلسلہ یونان و روم سے لے کر ہندوستان تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کہانیوں کے موضوعات زیادہ تر مذہبی یا تمثیلی نوعیت کے حامل ہیں اور یہ انفرادی کی بجائے اجتماعی انسانی زندگی کی پیش کار ہیں۔ اگر ان کہانیوں کے مفاہیم کھل جائیں تو انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز کی ساری گرہیں کھل جائیں۔ انسان میں اساطیر خلق کرنے کی صلاحیت قدرتی طور پر موجود بتائی جاتی ہے۔ ذکا الدین شایان بیسویں صدی کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

"اب موجود لحات میں زندہ رہنے والا شخص ماضی حال اور مستقبل کی تمام پرچھائیوں کا قیدی تھا۔ صدیوں پہلے کے مذہبی، دیومالائی اور داستانی واقعات، مہیب اور دیو قامت مجسمے، مافوق الفطرت مظاہر جن، دیو، پری، اژن کھٹولے اور خوف ناک لمبے چوڑے جسم حیوانات وغیرہ نئے انسان کے ذہن و خواب مین از سر نو بیدار ہوئے اور ان کی پرچھائیوں میں آدمی کی بنائی ہوئی تمام مصنوعی اور مشینی دنیا کی دیو قامتی پست اور چھوٹی ہو گئی۔" (۳)

اساطیر کے ذریعے قدیم انسان خود کو درپیش مسائل اور اپنے سوالات کیوں اور کیسے کے جواب کے ڈھونڈتے تھے۔ ان کے مسائل و سوالات کا بنیادی پیش خیمہ کائنات کی تخلیق کے اسباب و وجوہات کی تلاش تھا۔ انسانی بے بسی، قوت کی کمی اور بالخصوص موت وہ اسباب تھے جن کے سامنے وہ خود کو لاچار متصور کیا کرتے تھے۔ انسانی قوتوں کی معراج کا حصول ان کا دیرینہ خواب تھا چوں کہ دیوی دیوتا ان کے لیے سپر پاور ہو کر تھے لہذا اپنے گھڑے ہوئے بے شمار دیوی دیوتاؤں سے مدد اور طاقت طلب کرتے رہتے تھے۔ ان خود ساختہ دیوی دیوتاؤں کے عادات و خصائل تو انسانی ہی ہوتے تھے البتہ طاقت اور صلاحیت میں یہ انسانوں سے کئی گنا بڑھے ہوئے تھے۔ قدیم اساطیر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ غیر منطقی ہوتے ہوئے بھی منطقی لگتی ہیں، لایعنی ہوتے ہوئے بھی سچی معلوم ہوتی ہیں، مضحکہ خیز ہوتے ہوئے بھی انسانی حیرت و استعجاب کو بہترین طریق پر بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں۔ ان تمام تر غیر منطقی عناصر کے باوجود ان میں ابتدائی انسانی زندگی سے جڑی سچائیاں محفوظ ہیں جو تمام تر انسانی تہذیبی زندگی کے ارتقا کی ترجمانی کرتی ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دور کا انسان اب بھی جب کائنات اور نظام کائنات پر تفکر کرتا ہے تو اس طلسماتی حیرت کدے کی کوئی کلید اس کے ہاتھ نہیں آتی، کائناتی نظام کے بھید اور اسرار تاحال انسان پر منکشف نہیں ہو سکے تو قدیم انسان کی اس متعلق سوچ بچار اور اس کا اساطیر میں ظہور، کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔

بیش تر اساطیری ماہرین اسطورہ کو طہ انداز یا دشمنی دور سے جوڑتے ہیں۔ تمام مذہبی صحائف میں انھیں خرافات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اساطیر کو مذہب سے نتھی کرنے کی روایت قدیم ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں مذہب کی طرز پر خیر و شر کی باہمی کشمکش اور طاقت کا بیانیہ اساطیر کا بھی بنیادی موضوع ہے، یہاں دلچسپ امر یہ ہے کہ اکثر صحائف پر بھی اساطیری متن کے اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ علی عباس جلال پوری نے اپنی کتاب "روایات تمدن قدیم" میں دنیا کی پہلی رزمیہ نظم کی بابت فرما، ہم بنیادی معلومات پر روشنی ڈالی ہے نیز دنیا

کی قدیم ترین نظم کا متن بھی درج کیا ہے، اس نظم کا ترجمہ سید سبط حسن سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ نظم یہاں درج کرنا ضروری ہے تاکہ ابتدائی نظمیہ متن سے واقفیت حاصل ہو اور اس کی روشنی میں موجودہ نظم کا اساطیری رخ بھی واضح ہو سکے۔ علی عباس جلال پوری کے بہ

موجب:

"دنیا کی اس (گل گامش کا رزمیہ) رزمیہ کا شمار دنیا کی قدیم ترین نظموں میں ہوتا ہے۔ گل گامش کے رزمیے میں عالم گیر سیلاب کا قصہ بھی ملتا ہے جو انٹیم کی زبانی بیان ہوا ہے۔"

"بنی نور انسان کا شور و غل برداشت سے باہر ہو گیا ہے / اور ان کی بکواس کے باعث اب سونا محال ہے / پس دیوتاؤں کے دل میں سیلاب کا خیال آیا / لیکن میرے آقا یا نے مجھے خواب میں خبردار کر دیا / اس نے دیوتاؤں کی باتیں چپکے چپکے میرے گھماؤ کے گھر کو بتادیں / او شتر و پاک کے انسان بوبار اُتو تو کی اولاد! / اس گھر کو ڈھا دے اور ایک کشتی بنا۔ / تیرے جہاز کا ناپ یہ ہو / اُس کی شہتیر اُس کے طول کے برابر ہو / اُس کے عرشے کی کی چھت محرابی ہو / اُس تو س کہ مانند جو عالم سغلی کو ڈھانپے ہوئے ہے / تب تمام جاندار مخلوق کے ٹھم کشتی میں رکھ لے۔۔ / طلوع سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ میرے گھر کے لوگ میرے گرد جمع ہوئے / بچے رال لے آئے اور مرد ضرورت کی دوسری چیزیں / پانچوں دن میں نے جہاز کا پینڈا بنایا اور خم دار لکڑیاں جوڑیں / اور تب میں نے تختہ بچھایا / جہاز کی نچلی منزل کا رقبہ ایک ایکڑ تھا / اور بالائی عرشے پر ہر جانب ساٹھ گز تھا / اُس کے نیچے میں نے چھ طبقے بنائے گل سات / اور اُن کو میں نے نو طبقوں میں تقسیم کر دیا / اور حسب ضرورت چپڑ بھی ڈالے / میں نے چپوؤں اور لمبے شہتیروں کا بندوبست بھی کر لیا / اور ضرورت کی سب سب چیزیں فراہم کر لیں / بار بردار پیپوں میں تیل لے آئے / میں نے تار کول، ڈامر اور تیل کو بھٹی میں ڈالا / جہاز کی درزیں بند کرنے میں بہت سا تیل خرچ ہوا۔ / میں نے سونا چاندی، زندہ مخلوق، گھر کے لوگ عزیز رشتہ دار / مویشی، جنگلی اور پالتو جانور اور سب کارنگروں کو جہاز میں بھر لیا۔ / تب شام ہوئی اور طوفان کے راکب نے بارش شروع کی / میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو موسم نہایت خطرناک تھا / پس میں بھی جہاز میں سوار ہو گیا اور دروازے کو بند کر لیا / اب سارا انتظام مکمل تھا، دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ / طوفان سارا دن شور مچاتا رہا / اور اُس کی برہمی ہر لمحہ بڑھتی رہی / طوفان کے تھیرے فوجی حملوں کی مانند لگتے رہے / بھائی اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکتا تھا / اور زمین کے ہر رہنے والے آسمان سے بھی نظر نہ آتے تھے / یہاں تک کہ سیلاب نے دیوتاؤں کو بھی دہشت زدہ کر دیا۔ / چھ دن اور چھ رات آندھی چلتی رہی / بارش، طوفان، اور سیلاب نے دنیا پر غلبہ پا

لیا / ساتواں دن طلوع ہوا تو جنوبی طوفان تھم گیا / سمندر پر سکون ہو گیا اور سیلاب رُک گیا / میں نے رُوئے زمین پر نگاہ دوڑائی تو وہاں کامل سکوت تھا اور انسان مٹی کے ڈھیر بن گئے تھے / اکیس کوس کے فاصلے پر مجھے ایک پہاڑ نظر آیا اور میری کشتی وہاں جاگی / میری کشتی کوہ نصیر پر رُک گئی اور پھر ہلائے نہ ملی۔ / پانچواں دن طلوع ہوا تو میں نے ایک فاختہ کو آزاد کیا / وہ اڑ گئی مگر اُسے بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ ملی اور وہ واپس آگئی / تب میں نے ایک ابا بیل کو آزاد کیا / وہ اڑی مگر بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ ملی اور وہ واپس آگئی / تب میں نے ایک کُوے کو آزاد کیا / اُس نے دیکھا کہ پانی پیچھے ہٹ گیا ہے / پس اُس نے اپنا پیٹ بھرا، ادھر ادھر اُڑتا اور کاؤں کاؤں کرتا رہا مگر واپس نہ آیا / تب میں نے جہاز کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں / میں نے قربانی کی اور پہاڑ کی چوٹی پر شراب لُنڈھائی / میں نے سات دیکھے چولہے پر رکھے اور لکڑی، بید، دیودار اور حنا کا انبار لگایا / اُن کی خوشبو دیوتاؤں تک پہنچی / تو وہ مکھیوں کی طرح چڑھاوے کے گرد جمع ہو گئے "

(کتاب میں اس کے بعد عہد نامہ قدیم میں درج نوح کا قصہ درج کیا گیا ہے جس کے بعد وہ لکھتے ہیں)۔ عہد نامہ قدیم کا یہ بیان ظاہر اُسمیری قصے سے ماخوذ ہے۔ لیونارڈ وودلے جس نے شہر اُرک کی کھدائی کی تھی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ گل گامش کے رزمیہ کا سیلاب اور طوفان نوح واحد الاصل ہیں۔ ہندوؤں کا سیلاب کا قصہ بھی بابل کے واسطے سمیریانی سے اخذ کیا گیا تھا۔^(۴)

علم الاصلنام (Mythology) کے ماہرین کے مطابق تمام بنیادی علوم جیسے فلسفہ اور سائنس کی صورت پذیری میں، ان کے دائرہ کار کے تعین میں اساطیر کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ابتدائی طور پر کائناتی معاملات پر تفکر کرنے والے اذہان بلاشبہ ادیب ہی تھے۔ انھیں کے تخیل سے پھوٹے افکار نے ادھ کھلے بھیدوں سے متعلق سوچنے کی ابتدا کی۔ علوم کی بنیاد رکھنے میں ادب کے کردار سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یوں کہا جائے کہ تمام علوم ادب ہی کی کوکھ سے جنمے ہیں تو بے جا نہیں۔ بعد ازاں ان کے اپنے اپنے دائرے وجود پذیر ہوئے۔ یہاں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ ادب کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ ساحل معلوم تحقیق کی روشنی میں تو ادب کی ابتدائی صورتیں بھی اساطیر ہی ہیں۔ یہ جواب کئی حوالوں سے قرین قیاس لگتا ہے۔ انسانی تخیل کی ابتدائی کار فرمائیاں، حیرتیں، تجسس یقیناً من گھڑت قصے کہانیوں میں ڈھلین جنہیں اب ہم اساطیر کہتے ہیں۔ ابتدائی دانش سے ماخوذ ان اساطیری کہانیوں کی زیادہ تر تین بنیادی صورتیں گونا گوی جاتی رہی ہیں:

- ۱۔ دیومالا: یہ کہانیاں دیوی دیوتاؤں اور ماورائی طاقتوں کی فرضی سرگرمیوں کو محیط ہوتی ہیں۔
- ۲۔ لیجنڈ یا ساگا: یہ وہ کہانیاں ہیں جو قومی سوچ کو کسی تاریخی واقعہ، جنگ یا یلغار کے ذریعے تحریک دیتی ہیں۔
- ۳۔ لوک کہانی / فوک لور: یہ کہانیاں تفریحی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔

اس میں کسی تامل کی گنجائش نہیں کہ انہی من گھڑت کہانیوں نے مابعد کئی اصناف کی صورت گری کی۔ داستانیں، مذہبی حکایات، رومانوی اور لوک کہانیاں، ڈرامہ، مثنویاں، اور رزمیہ شاعری کی سبھی اشکال زیادہ تر اساطیر ہی سے پھولی ہیں۔ افسانہ، حکایت، رومان سے لے کر خرافات تک کئی اہم اصطلاحات کو تاریخی کتب میں اسطورہ ہی کہا گیا ہے۔ یوں یہ کہنا بے جا نہیں کہ بیش تر ادبی اصناف کے تشکیلی دورانیے میں، ان کے خدو خال تراشنے اور سنوارنے میں اساطیر نے بہ طور عمل انگیز کے اپنا خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ یوں موجودہ دور تک مختلف النوع اصناف میں تخلیق کی جانے والی اساطیر کی کئی صورتیں ظہور پذیر ہو چکی ہیں جن کی شناخت کے لیے ان کی درجہ بندی از بس لازم امر ہے۔ اسی طرح نئی اساطیر کی تخلیق بھی ہر صنف میں اپنا وجود منو اچکی ہیں۔ ہمارے کچھ ناقدین اب بھی اساطیر کی تشکیل نو کو نہیں مانتے لیکن مغرب میں اس حوالے سے کافی کام ہوا ہے۔ اس حوالے سے فہیم اعظمی نے لکھا ہے:

"جدید تخلیقی ادب میں اساطیر کا شعوری اور غیر شعوری استعمال بہت عام ہے۔ یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ جدید تخلیق کار قدیم تخلیقات سے انحراف بھی کرتا ہے لیکن اساطیر کے معاملے میں روایتوں پر انحصار بھی کرتا ہے۔" (۵)

اساطیری طرزِ اظہار اور نظم میں گہرا سمبندھ ہے۔ اردو نظم میں اساطیری اور داستانوی رنگ ابتدا ہی سے موجود رہا ہے لیکن بالخصوص ساٹھ کی دہائی کے بعد اس کے خدو خال مزید واضح ہونا شروع ہوئے۔ اسی دور میں نظم میں اسطوراتی علامات اور مذہبی اور لوک تلمیحات کا ایک جہاں آباد ہونا شروع ہوا جس سے نظم کے معنوی دائرے میں وسعت پذیری در آئی اور اس کی تنظیم اور ابلاغ میں رکاوٹ۔ اکیسویں صدی کے مابعد تخلیق ہونے والی نظموں میں اسطوراتی فضا کی وجہ سے علیحدہ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں، پرانی نظم کی بہ نسبت یہی رخ موجودہ نظم کی وجہ امتیاز ہے۔ معاصر نظم گونے اسطورہ کی مجموعی فضا اور لسانی نظام کو گرفت میں لے کر نئی اساطیر گھڑنے کی خصوصی طرح ڈالی ہے۔ اب ان نئی اساطیر کا مطالعہ بھی دو سطحوں پر کیا جاسکتا ہے۔

اول۔ پرانی اساطیر کانٹے اسالیب اور نئے ڈھنگ میں بیان، جو کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔

دوم۔ نئی اساطیر یا اساطیری اور پُر تخیل طرزِ بیان کی تشکیل اور اس کی جملہ صورتیں، جو موجودہ نظم میں کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔

بلوچستان کے شعری سیاق بالخصوص علاقائی زبانوں کے ادب اور شاعری میں اسطورہ ان تمام متذکرہ صورتوں میں موجود رہا ہے۔ ان میں لہجہ یا ساگا کا حصہ خصوصی توجہ کا حامل ہے۔ یہاں کا موجودہ ادبی منظر نامہ یہاں کی قبائلیت اور مقامی زبانوں میں کثرت سے تخلیق کردہ لہجہ اور لوک ادب کا پیش خیمہ ہے۔ یہاں کی قومی زبانوں کے ادب میں قبائلی زندگی کے قیام و دوام میں اہم اور بنیادی کردار ادا کرنے والے بہادر شخص (ہیرو) کی نبرد آزمائیاں اور فتح یابی کے قصے مقبول عام رہے ہیں۔ بلوچستان کی بڑی قبائلی تہذیبوں نے ہمیشہ سے اپنی بقا کے لیے باقاعدہ جنگیں لڑیں ہیں چنانچہ یہاں کا لوک ادب، بہادری اور سرخروئی کی انھی داستانوں سے بھرپڑا ہے۔ غیرت، بہادری، اپنی املاک کی حفاظت اور قبائلی تفخر کا استحکام، ان داستانوں کے عام موضوعات ہیں۔ یوں یہاں کی قبائلی شاعری میں بھی اساطیر کی تمام مجتمع اشکال دستیاب رہی ہیں۔ قبائلی شاعری میں موجود متذکرہ تمام اساطیری عناصر اور داستانوی طرزِ بیان اپنے مکمل جوہر کے

ساتھ ساتھ، موجودہ عہد کی بہت سی خصوصیات سمیٹتے ہوئے معاصر بلوچستانی اردو نظم کی بنت میں شامل ہوا ہے۔ بلوچستان کا قبائلی رنگ، لیجنڈریا سا گام کا مکمل رنگ و آہنگ صادق مری کی ہر ہر نظم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں کا بلوچی نوک لور جس تفصیل کے ساتھ ان کی نظم کا حصہ بنے ہیں اس کی مثال کسی اور کلام سے دینا ممکن نہیں۔ ان کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

"دھندلکے میں کہاں تم کھو گئے بالاچ / کہیں کیا سو گئے بالاچ / اب اس سے پیشتر کچھ حادثہ ہو /
دیر ہو جائے / نکل آؤ کماں سے تیر کی صورت / کہ پھر سہمی کی حرمت پر نہ حرف آئے / کہاں
کس اوٹ میں چٹان کی / گم ہو / کہاں اوڑھے ہوئے تم خاک / او جھل ہو / اٹھو دیکھو یہ بے گور
و کفن لاشہ / یہ دودا ہے / سکوت ایسا / کہ آہٹ چیخ سے بڑھ کر سنائی دے / دھندلکے میں کہاں
تم ہو / اب اس سے پیشتر کچھ حادثہ ہو، دیر ہو جائے / کسی سہمی / کسی دودا، کی خاطر اب نکل آؤ
/ کماں سے تیر کی صورت / کوئی اڑتا پرندہ ہی دکھائی دے / کوئی نغمہ سنائی دے"

"بالاچ گورگنج" ایک بلوچ شاعر اور انتقام کا دیوتا جس نے ایک خاتون "سہمی" کی حرمت پر جان دینے والے اپنے بھائی "دودا" کا دشمنوں سے انتقام لیا۔

(۱)
(دھندلکے میں اٹھو بالاچ!، صادق مری)

معاصر نظم میں موجود اساطیر کو اپنے پلاٹ، تکنیکی پیرائے، کردار سازی اور لسانی نظام سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔ کائنات کی مقناطیسی گردش و ماورائیت، زمان و مکان کا لامحدود و مبہم تصور، ازل سے ابد تک کا نامختم سفر، تہذیبی تبدیلیاں اساطیر کا مواد بنتی رہی ہیں۔ یہ مفروضاتی و تخیلاتی مواد ادب کے بھی تار و پود میں گندھا ہوا ہے۔ اساطیر کی پُر تہیر، تخیلاتی، طلسماتی فضا داستانوں، سفر ناموں اور افسانوں کی ساخت میں بن دی گئی ہے۔ اساطیری کردار جن، بھوت پریت، دیوی دیوتا ہوں یا انسان، پرندے اور جانور ہوں دونوں صورتوں میں ان کی خوبیاں مافوق الفطرت ہوتی ہیں۔ ان میں ہیر، سپر مین یا جادو گروں جیسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ تفکر کریں تو غزل میں محبوب، قصیدے میں بادشاہ اور مرثیوں میں مذہبی اصحاب کی ماورائی خصوصیات اور متذکرہ کارنامے، اساطیری اثرات ہی کے حامل ہیں۔ عصری بلوچستانی نظم میں اساطیر کے استعمال کی سبھی اشکال نشان زد کی جاسکتی ہیں۔ لیکن مختلف اساطیر کو بنیاد بنا کر یا اساطیری اندازِ بیاں کو گرفت میں لے کر خود اسطوراتی فضا گھڑنا، یہ صورت یہاں کی نظم کو سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ منیر مومن بلوچی زبان کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی نظم اپنے علامتی و اساطیری پیرایہ کے حوالے سے اپنی خصوصی شناخت رکھتی ہے۔ یہاں ان کی ایک نظم کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے:

"دنیا۔ ایک ایسا شاندار گھر

جس سے باہر نکلنا بھول جاتے ہیں لوگ

زندگی۔۔

خدا کے بخشے ہوئے موسموں میں سے ایک موسم

اور عشق۔۔

خدا کے گھر سے چرایا ہوا ایک چراغ!

مجھے جتو کے جامن کے باغ کے

ان پہاڑی بیروں کی لذت بالکل یاد نہیں آتی

لیکن وہی بیر چرانے کا ذائقہ

میری زندگی کی شیریں ترین یاد ہے!

جب بھی تجھے دیکھتا ہوں

ایسا لگتا ہے

جیسے میں خدا کے کھیت میں

ایک عظیم الشان درخت سے

روشن بیر چرا رہا ہوں!"

(۷)

(روشن بیر، منیر مومن، اردو ترجمہ: احسان اصغر)

اساطیر میں حیرت و استعجاب، تجسس و خوف، وسوسے و توہمات، ہیبت و وحشت جیسی کئی کیفیات کو متحرک کیا جاتا ہے جس کے لیے مخصوصی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ دراصل اساطیر اپنی زبان کی وجہ سے ہی قائم ہوتی ہیں۔ اساطیر کی زبان متفخرانہ بہ یک وقت چو نکانے، ڈرانے، دھمکانے والی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رومانیت، داستا نویت، ڈرامائیت اور افسانویت سے بھی بھرپور ہوتی ہے۔ علاقیت اس کا خاص وصف ہے جبکہ علامتیں زیادہ تر مناظر فطرت سے مستعار لی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اساطیر ادبی جمالیات کو اجاگر کرنے میں بڑی معاون رہتی ہیں اس لیے بھی ان کو تلف کرنا ممکن نہیں۔ اساطیر کے ذریعے نظم کے جمالیاتی اور ڈرامائی تاثر کو با آسانی بڑھایا جاسکتا ہے۔ اکثر شاعر غیر ارادی طور پر اساطیری اسلوب استعمال کرتے ہیں لیکن بلوچستان کی نظمیں اساطیری جمالیات کی پیش کش کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ عدن عدیم کی نظمیں اپنی فضا، علامات اور کرداروں کے ذریعے موجودہ عصر کی اساطیری امیجز بڑی خوبصورتی سے تخلیق کرتی ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

"درخت اُٹے ہوئے ہیں اک دوسرے پہ / رستہ / مہیب سائے کی اُلجھنوں سے / نکل رہا

ہے / طویل دُوری پہ دُور دکھتا ہوا مسافر / قدیم رستے کو اپنے قدموں کی / چاپ دے کر / نکل

گیا ہے / حروف ہیں، / لفظ ہیں ورق پر / مچلتی آواز اور ہاتھوں میں آہنوسی سرو دے، / اور

سکوت ہے، سکوت۔۔ / ساکت / ہوا سماعت میں بچ رہی ہے / سکوت۔۔ پھر بھی سکوت
۔۔ ہے / رقص ہے / مسلسل۔۔ نمود ہے / اور جمود ہے / جمود۔۔ / جامد / نظر کی سرحد سے
ماورا تک / ہے جاہ جاتک / مدار اندر مدار لرزش / جمود۔۔ / پھر بھی جمود۔۔ ہے / اور نزول
ہے / پہاڑ راتوں میں سرد کہسار / برف اوڑھے کھڑے ہیں / سردی سے کانپتے ہیں / سماعتوں
میں سکون بھرنے / سفر پہ چشمے نکل پڑے ہیں / تو برف / پھولوں کی طرح اُن پر / برس پڑی
ہے / برستی بوندوں کی / پہلی سکی دھک سے نیندوں کی / نیند ٹوٹی / تمار ٹوٹا ہے / بیاس اُٹھی ہے
ریگزاروں سے / ڈھول ہو کر اُٹھا کے گرداب / اریت خود سے لپٹ گئی ہے / تھکن رسیدہ تمام
چشمے / لمند پھینکے ہوئے ہیں / آتش فشاں میں محذوب ہو گئے ہیں / طویل ڈوری پہ / ڈور دکھتا ہوا
مسافر / فلک پہ جا کر / زمین کی دھڑکن کو سُن رہا ہے / سمجھ رہا ہے / زمین زندہ ہے، / اُو نگھتی
ہے / درخت اُڈے ہوئے ہیں اک دوسرے پہ / راستہ / مہیب سائے کی اُلجھنوں سے نکل رہا
ہے"

(۸)

(Earth، عدنان عدیم)

اساطیر گھڑنے کے لیے غیر معمولی صلاحیت درکار ہوتی ہیں اور دیومالائی انداز فکر بھی۔ اسطورہ کے طرز پر پلاٹ بنانا پھر اسے
افسانے یا نظم کی شکل دینا، فکری و فنی علویت کا متقاضی ہے جو خلاق تخلیقی کاروں کے حصہ ہے۔ اس کے لیے کمال ریاضت اور خدا نیا د
صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ گہرے اور وسیع مطالعے کے ساتھ مستحید کی قوت کا بھی مضبوط ہونا بہت ضروری ہے۔ دانیال طریر کی طویل
نظم "خدا میری نظم کیوں پڑھے گا" ان تمام اسطوراتی خصائص سے مزین ہے جس کا تذکرہ کیا گیا۔ اس نظم میں سے اساطیر کی نشان زد نما
م اشکال بہ آسانی بہ طور مثال پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہاں ان کے نظمیہ مجموعے "معنی فانی" سے ایک نظم درج کی جا رہی ہے جو
"اسطورہ" کے عنوان کے تحت لکھی گئی مندرجہ ذیل نظم کئی حوالوں سے خصوصیت کی حامل ہے۔ نظم کے آخری دو مصرعوں کمال طریق
سے نہ صرف نظم کی معنوی کا یا پلٹ دی، بلکہ تمام من گھڑت قصوں پر حقیقت کی مہر ثبت کر دی ہے۔ شاعر کے مطابق اگر اساطیر کو
زمانوں کی قید سے آزاد کر دیا جائے تو یہ من گھڑت قصے کسی نہ کسی زمانے میں سچ ہو جاتے ہیں۔ شاعر در حقیقت اس نظم میں تخلیق اور
ادب میں مضمر اسی آفاقیت کو بیان کر رہا ہے کہ ادبی اساطیر ہوں، دیومالائی قصے، فرضی حکایتیں ہوں یا مافوق الفطرت داستانیں، جو آج
جھوٹ یا لغو معلوم ہوتے ہیں وہ آنے والے زمانے میں حقیقت کا روپ دھارن کر لیتے ہیں یعنی ادیب کی نظر فردا جھانکنے پر قادر ہوتی
ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

"میں نے اس عفریت کا قصہ سنا ہوا ہے

جس نے سورج پھانک لیا تھا

پریت پریت آگ بھری تھی، خشک رگوں میں
جس نے دھرتی کے سینے میں لاگ بھری تھی

زرد رتوں میں

گہری خاموشی کے منہ میں شور بھرا تھا

کال کنوئیں کا

جس نے فضا کی انگھٹی پرتھال دھرا تھا

سرخ دھوئیں کا

رستہ رستہ ویرانی کے جال بچھائے، سائے اگائے

جس نے پیڑوں کی شاخوں پر سانپ بٹھائے، چھن پھیلائے

میں نے ماضی کا وہ حصہ چنا ہوا ہے

جس نے فردا جھانک لیا تھا"

(۹)

(اسطورہ، دانیال طریر)

ساٹھ کی دہائی میں اردو افسانے میں بہت سی واضح تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں علامت اور اسطورہ کا کثیر استعمال شامل ہے۔ افسانے کے ساتھ ساتھ یہ علامتی اور اساطیری جہان معاصر نظم میں بھی غالب عنصر کی طرح موجود دکھائی دیتا ہے، جس کی کئی وجوہات ہیں۔ دنیا میں ترقی کی تیز رفتاری اور آئے دن کی رنگ بدلتی زندگی نے بالعموم بیسویں صدی اور بالخصوص اکیسویں صدی کے انسان کو مظاہر فطرت کی بجائے ترقی کے اس طاقت ور دیو کے سامنے بے بس بنا دیا ہے۔ ٹیکنالوجی کے بڑھتے عرفیت نے کہیں نہ کہیں اس اساطیری فضا کو حقیقت ثابت کر دیا ہے جس کے بارے میں ابتدائی طور پر انسان قہے گھڑا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی طاقتیں جس زبان میں دنیا کے پس ماندہ ممالک سے مکالمہ کر رہی ہیں اسے بھی اساطیری زبان اور فضا کی پیش کش کے ذریعے ہی احاطہ تحریر میں لایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر نظم اسی میر العقول فضا اور دیوی دیوتاؤں کے جاری کردہ احکامات کی طرز پر موجودہ سیاسی صورت حال کو پیش کر رہی ہے۔ بلوچستان میں تخلیق ہونے والی موجودہ نظم اساطیری فضا اور زبان کو گرفت میں لے کر معاصر بلوچستانی سیاسی تناظر کو کمال ہنرمندی سے پیٹ کر تی دکھائی دیتی ہے۔ نظمیں دیکھیے:

"یہ جنگل اب اور گھنا ہے

لہو میں ایک اک پیڑ سنا ہے

چھدر چھدر اساجیرا

کوئی رستہ، کوئی تارا

کہیں نہیں اب کہ کہیں نہیں ہے
ستاٹا ہے، تاریکی ہے
دھرتی جو زخمی زخمی ہے
ہر سمت آڑو ہوس کی دلدل
خس کا ہر سو پھیلا جنگل
دہشت ناک درندہ آنکھیں
ہول بھری وحشی آوازیں
لحہ بھر کوسٹائے میں
اُبھریں اور پھر گم ہو جائیں
ستاٹا سا ستاٹا ہے
گلی سڑی لاشوں کی بُو ہے
اور لہو ہے
جو بکھرا بکھرا ہر صُوبے
مصلحتیں، خاموشی اوڑھے کونوں کھدروں میں ڈبکی ہیں
ہر منظر بس لہو سنا ہے
عبرت کی تصویر بنا ہے "

(۱۰)
(عبرت کی تصویر، عین سلام)

"میں تاریخ میں کہیں بھی موجود نہیں ہوں
مگر پوری تاریخ
تمام جینیٹک اوصاف کے ساتھ
کسی کمپیوٹر کی چپ کی طرح
مجھ میں سہاگئی
میری روح کی اداس آنکھوں کے دریچوں سے
جب کوئی خواب اندر آنا چاہے
توروشنی کے پردوں پر

اساطیری کرداروں کے سائے
ہیولے بن کر رقص کرنے لگتے ہیں
میرے احساسات کے گھنے جنگلوں میں
اب بھی شیاطین کا بسیرا ہے"

(11)
(آفاقی روح، منتخب حصہ، غنی پہوال)

"ابولہول کی دنیا میں
فریادیں جو کرتے ہیں
اہراموں کے اندر سے
چینوں سے یہ لکھتے ہیں
دیواروں کے اوپر بھی
رنگوں میں یہ چھپتے ہیں
تابوتوں کے کونے میں
"کا" نامی اک کوا ہے
زندہ لاش کے سینے میں
پتھر سادل رکھا ہے
سنانا سار ہتا ہے
ابولہول کی دنیا میں
آج بھی ایسا ہوتا ہے
فریادیں جو کرتا ہے
فرعونوں کی آوازیں
اہراموں کے اندر سے
دہشت کی ہر آہٹ پر
چینوں سے یہ لکھتی ہیں
ان کو بھی دفنادیں گے
دیواروں کے اوپر سے

پتھر پھینکے جاتے ہیں
شام پہ سرخی چھاتی ہے
بے کس، بے بس، بیچارے
رنگوں میں چھپ جاتے ہیں
تابوتوں کے کونوں میں
ٹکڑے پھینکے جاتے ہیں
"کا" نامی اک کو ابھی
زندہ لاشیں کھاتا ہے
دھک دھک کرتی ہیں آپیں
سانا سا چھاتا ہے
ابولہول کی دنیا میں
اہراموں کو موت نہیں...."

(۱۲)

(فرعون زندہ ہیں، تمثیل حفصہ)

معاصر نظم میں اساطیر کی موجودگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موجودہ عہد کے بیش تر شاعر مغرب و مشرق کے قدیم ادب (یونان، روم، مصر و بابل، مہاتما بدھ، رمان، مہابھارت) نیز مذہبی صحائف (توریت، انجیل، قرآن) سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام لوک ادب بھی ہماری جڑوں میں موجود ہے۔ یوں ہمارا تمام تہذیبی سرمایہ بہ صورت اساطیر ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ انسانی ارتقا کا جزو لاینفک ہیں۔ یوں اساطیر کا وہ حصہ جو اب ہماری تہذیب و تمدن، زبان، مذہب اور اسلاف سے جڑ گیا ہے، ہمارے رسوم و رواج میں داخل ہو گیا ہے، بلکہ یوں کہنا درست ہو گا کہ ہماری تواریخ (Genes) میں بہ طور پرنٹ کے شامل ہو چکا ہے، ہمارے شعر و ادب میں اس کی دہرائی کا عمل جاری رہے گا۔ بہ طور نمونہ چند نظمیں دیکھیے:

"تشدد کو الوہیت نہ کہنا

خدا کے مسترد فرمان کیا تم نے سنے ہیں

تمہیں معلوم ہے کہ حق اگر مقتول نہ ہو

باعث تقلید آدم ہو نہیں سکتا

کفن گننے سے شب سے

قتل امکان و فاسے

تمہیں فرصت کا وہ لمحہ ملا ہے
(جہاں شیطان اپنی کھال کو
تبدیل کرنے کے لیے اک مدت محدود چاہے تو)
بشارت خواب، نیکی سے بھری آنکھیں
فلک کے گہرے نیلے پانیوں کو
صرف انکارہ سمجھتی ہیں
جو انگارہ زمین کو خاک کرتا
اور فضا کو راکھ کرتا ہے
تمہیں اڑتے پرندوں سے محبت ہے!
محبت عہد نامہ ہے
زبورِ عصر کی متروک ہوتی اصطلاحوں کا
کسی فہرست میں کھو جو
کسی خاکستر زریں ورق پر
آنسوؤں کی ان بجھی تحریر میں ڈھونڈو
مگر تم جانتے ہو کہ محبت دستِ دل پر
اک مقدس بیعت نامختم ہے
اور تمہارے ہاتھ پہ کتنا اہو ہے "

(۱۳)

(بغداد کا آسمان، بیروم غوری)

"محبت ہے شہرِ اساطیر کا وہ پرندہ
کہ جس کے پروں کی سماوی رسائی
زماں سے زماں تک
نشاں سے نشاں تک رہے گی!
ابھی اس سمندر کی پہنائی میں ہیں
کئی لاکھ برسوں کی آئندہ و رفتہ لہریں
یہ لہروں کی مہتاب گا ہیں

کہ جن کی رگوں میں رواں ہے کہیں صبح پہنچیں
اور کہیں عصرِ مقتل
کسی لہر پر نقش، فرہاد و شیریں کے قصے
کہیں پر تصوف کی حیرت سرا
جہاں گو نجی ہے ابھی تک "انا الحق" کی زخمی صدا
کراں تا کراں!
یہ وہ بے خودی ہے
کہ جس کی روایت میں زندہ ہیں اب تک
خلا و ملا کے مساکن،
یہ دریا،
یہ بے نم بیاباں،
یہ مٹی،
یہ مٹی کا اظہار

(۱۳)

انساں! (محبت، احمد شہریار)

"کہا میں نے و تاپو!
بہت سچ ہے زمستاں
ضعیفی میں نحیفی
سہی جاتی نہیں بیٹے
تمہارا قرب ہے رب سے
تمہیں وہ خوب سنتا ہے
اُسے کہنا
ہمیں دوزخ سے تھوڑی آگ تو دے دے
و تاپو نے کہا اتاں!
وہاں تو جو بھی جاتا ہے
وہ من دھونی میں جل بھن کر

خود اپنی آگ اپنے سنگ
یاں سے لے کے جاتا ہے
جنم کی تو اپنی آگ ہوتی ہی نہیں ہے! "
"و تا یو فقیر"، سندھ کا ایک درویش منش لوک کردار

(۱۵)
(آگ، عمران ثاقب)

مابعد جدید دور کے لکھاریوں نے تمام تر روایتی بیرونیوں سے شدید بیزاری دکھائی ہے اور حتی الامکان ان سے انحراف کیا ہے۔ لیکن اساطیر کے معاملہ مختلف نوع کا حامل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اساطیر میں ہمہ وقت تازگی اور جدت کی صفت کی وجودگی ہے۔ کچھ ناقد اسے کلیشے سے تعبیر کرتے آئے ہیں لیکن دیگر اس کی تازگی، نئے پن اور کلیشے کو توڑنے کی صلاحیت کے معترف ہیں۔ کلیشے میں تبدیلی بھی حیرت و استعجاب اور فرحت کو جنم دیتی ہیں جو خود اساطیری دائرہ کار میں شامل ہے۔ آج دنیا بھر میں اساطیر کا سب سے بنیادی کلیشے "خیر و شر" کی جنگ اور خیر کی غالبیت، ہی توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کا شکار ہو گیا ہے۔ آج جو اساطیر نظمیں یاد دیگر ادبی اصناف میں قلمبند ہو رہی ہیں وہ مثبت کی بجائے منفی قوتوں کے بیانے پر مشتمل ہے۔ شر کی طاقت و قوت کا مہا بیانہ۔ مابعد جدید دور میں منفی قوتیں خدائی قوت کی طرح دنیا سے ہم کلام ہیں اور فتح یابی بھی ان ہی کے حصے میں آرہی ہے۔ خیر اور نیکی اور ان کی قوتوں کی کہانیاں اب واقعتاً اساطیری نوعیت اختیار کر گئی ہیں یعنی محض ماضی کی داستانیں بن کر رہ گئی ہیں۔ آج کے دور کی اساطیر سائنس فکشن کی صورت میں اپنی موجودگی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یا "بگ باس چاہتے ہیں" جیسی مشہور تشکیلی حقیقت کی طرز پر۔ موجودہ عصر میں شر کی تمام قوتیں خیر کی سبھی علامتوں پر غالب آگئی ہیں۔ دنیا کی خدائی قوتیں تیسری دنیا کے باسیوں سے کس طرح کلام کر رہی ہیں؟ کس طرح اپنی فتح کا جشن منا رہی ہیں؟ نوشین قبرانی کی نظمیں اس کی بہترین عکاس ہیں۔ یہاں ان کی ایک نظم کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے:

"جنگلوں میں گھسی جھاڑیوں سے نکلتی ہوئی

کس نے دیکھی تھیں

صحراؤں میں تشنگی ناپتی

ڈر کے غاروں میں سہمے ہوئے

چارپایوں کے تن پہ برستی ہوئی مہرباں و سعتیں؟

کیا خبر ان ابد گھائیوں سے پرے

ڈر کے غاروں میں سہمے ہوئے چارپائے کہیں

دور و وحشت سے تہذیب تک کے بڑے

لیے کے ہوں پھر منتظر۔۔؟
اور اُن پر برسے لگیں مہرباں ہو کے
شیطان گرو سعتیں۔"

(۱۲)
(The Axiom of Infinity، منتخب حصہ، نوشین قبرانی)

ہر قوم کچھ ایسے انفرادی تہذیبی خصائص کی حامل ہوتی ہے جو اسے دیگر اقوام سے ممیز کرتی ہے۔ چنانچہ یہی انفرادی اوصاف اس کی شناخت کو مستحکم کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ ان تہذیبی اوصاف کی تشکیل میں کئی عناصر شامل کار رہتے ہیں۔ ہر قوم اپنے جغرافیے، اپنی آب و ہوا، اپنے معاشی نظام، اپنے رہن سہن سے اپنا تہذیبی مزاج طے کرتی ہے اور پھر یہی مزاج اس کے فوک لور کو متشکل کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فوک لور سے کسی بھی قوم کے تہذیبی مزاج کے خدوخال اخذ کیے جاسکتے ہیں تو بے جا نہیں۔ عتیق اللہ اپنے مضمون "آر کی ناسپ: تصور اور تنقید" میں رقم طراز ہیں:

"اسطور کے تاریخی، نیم تاریخی ہیرو اور ان کے مخاطراتی کارنامے، مذہبی مہم جوئیاں، عوامی تہوار، تقریبات، اولیا، انبیاء، اور ان سے منسوب محیر العقول معجزات، ان کے سوانح، فلسفی، دانش ور اور ان کے رہ نما اصول، لوک مسلمات، کہاوتیں، اقوال اور مقبول عام سینہ بہ سینہ چلے آنے والے روایتی قصے، حکایتیں اور محاضرات وغیرہ نسلی حافظے کا وہ متحرک مواد ہیں جو کسی قوم کی انفرادی اور اجتماعی تہذیبی و ذہنی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں۔" (۱۴)

بلوچستانی اقوام ایسے ہی منفرد اوصاف کی حامل اقوام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا فوک لور بھی ایسے ہی انفرادی نقوش رکھتا ہے جنہیں اسی مٹی اور مزاج کے ساتھ جوڑ کر ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ بلوچستان کا منفرد پینوراما، یہاں کا لینڈ اسکیپ، تہذیب و تمدن و ثقافت، فوک لور، اہم تاریخی واقعات و کردار، زمینی، سیاسی اور معاشی حقائق، مسلسل کشاکش، مزاحمت و بغاوت، یہ سب رجحانات مل کر معاصر نظم کا خمیر بنتے ہیں مختصر اُبلوچستان بنیادی مرکزے کے طور پر اس نظم کا محور و محرک ہے، معاصر نظم کے تمام شاخصانے اسی مرکزے سے پھوٹے ہیں اور اسی کے گرد اپنا تانا بانا بننے دکھائی دیتے ہیں۔

موجودہ زندگی اپنے کل میں ایک بالکل نئے اور بڑی حد تک ایک مہم منظر نامے کی پیش کار ہے۔ سیاسی اور سماجی زندگی کے جملہ پہلو پچیدگی کا شکار ہو چکے۔ موجودہ عہد کی پرت در پرت تہہ داری نے اساطیر کے تفریحی مقاصد کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ لیکن انہیں کی تخلیق کے نئے اسباب بھی پیدا کر دیے ہیں۔ ان کے اہتمام سے نئے بیانیے تشکیل دیے جا رہے ہیں اور اس مہم صورت حال کے ساتھ ہم آہنگی کی نئی صورتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ اکیسویں صدی کے ڈرامائی ظہور کے بعد یہ دیومالائی قصے، کہانیاں، واہموں کی بجائے حقیقت کی غمازی کرنے کے قابل ہو گئی ہیں اور ماہر انہ استعداد کے ساتھ اس غیر یقینی اور پل بدلتی صورت حال کا سامنا کرنے لگی ہیں

جو معاصر منظر نامے کی دین ہے۔ معاصر عہد بہ ذات خود ایک اسطورہ ہے جس کی تیز رفتار سفاکیت پر تاحال غیر معمولی انسانی دانش یقین نہیں کر سکی۔ چنانچہ بلوچستان، اکیسویں صدی کے مضمرات، موجودہ ٹیکنالوجیکل عہد تک انسان کا ذہنی و تہذیبی ارتقا اور اس تیز رفتار عہد میں اپنے وجود کی شناخت اور اپنے ہونے کے جواز کی تلاش، یہ سب معاصر نظم کا اہم موضوعی دائرہ بنتے ہیں۔ بلوچستانی کے نظم گو شعر انے اپنی پُر زور متخید کے زیر اثر اس عہد کی تصویر کشی کرنے کے نئے نئے روپ تراشنے اور نئی اساطیر خلق کرنے کی عمدہ کاوشیں پیش کی ہیں نیز معاصر بلوچستانی نظم اپنی منفرد فضا، علامات اور امجز کے اعتبار سے مجموعی عصری اردو نظم کا بھی ایک منفرد حوالہ بن رہی ہے۔ ان اوصاف کی روشنی میں یہاں کی نظم کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

- ۱۔ سہیل احمد خان، مجموعہ سہیل احمد خان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱۷
- ۲۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۳-۶۵
- ۳۔ ذکا الدین شایان "جدید اردو نظم میں علامتوں کا استعمال، مشمولہ، اردو نظم ہیئت و اور تکنیک، مرتب، خوشحال ناظر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۳-۱۳۴
- ۴۔ علی عباس جلال پوری، روایات تمدن قدیم، تخلیقات، لاہور، بار سوم، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷-۲۲
- ۵۔ فہیم اعظمی، آراء، مکتبہ نصیر، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۷
- ۶۔ صادق مری، کاریزوں میں بہت پانی، مہر در ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، کوئٹہ، ۲۰۲۳ء، ص ۱۳۶-۱۳۷
- ۷۔ منیر مومن، گمشدہ سمندر کی آواز، مترجم، احسان اصغر، عکس پبلی کیشن، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۵۶-۵۷
- ۸۔ عدن عدیم، لفظ مقدس ہوتے ہیں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۱-۱۳۶
- ۹۔ دانیال طریب، معنی فانی، مہر در انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، کوئٹہ، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲
- ۱۰۔ عین سلام، گہر گہر ستارگی، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۱۱ء، ص ۲۲۲
- ۱۱۔ غنی پھوال، سانسوں کی کشتیاں، رنگ ادب پبلی کیشن، کراچی، ۲۰۱۹ء، ص ۳۷
- ۱۲۔ تمثیل حفصہ، فرعون زندہ ہیں (نظم)، مطبوعہ: سنگت (ماہنامہ)، جلد ۱۲، شمارہ ۳، فروری ۲۰۱۸ء، ص ۴۸
- ۱۳۔ بیرم غوری، نجم تمہید شب، گوہر گہر پبلی کیشنز، کوئٹہ، ۲۰۲۳ء، ص ۱۰۵-۱۰۴
- ۱۴۔ احمد شہریار، اک قدم اور، کولاج پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۵۵-۵۶
- ۱۵۔ عمران ثاقب، چپ کی چاپ، مہر در انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، کوئٹہ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۰۱
- ۱۶۔ نوشین قمبرانی، The Axiom of Infinity (نظم)، مطبوعہ: سنگت (ماہنامہ)، جلد ۲۰، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص بیک ٹائٹل
- ۱۷۔ عتیق اللہ، "آر کی ٹائپ: تصور اور تنقید"، مشولہ، تنقید کی جمالیات، جلد ۸، مرتب، پروفیسر عتیق اللہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۸۳

References in Roman Script:

1. Suhail Ahmad Khan, Majmooa Suhail Ahmad Khan, Sang E Meel Publications, Lahore, P. 217
2. Qaazi Abid, Doctor, Urdu afsana or isateer, Mujals Tarqi Adab, Lahor 2009, P. 64-65
3. Zakka Udin Shayaan, Jadid Urdu Nazm Mian Alamatan Ka Istemal, Mashmola, Urdu Nazm Hait aur Technique, Muratab, Khushal Nazir, Misal Publisher, Faisalabad, 2018, P. 143-144
4. Ali Abbas Jalal Puri, Riwayat E Tamadun E Qadeem, Takhleeqat, Lahore, Third Addition, 2002, P. 17- 22
5. Faheem Azmi, Aara, Maktaba E Sarir, Karachi, 1992, P. 119.
6. Sadiq Marri, Karezon Main Bahta Pani, Mahr dar Research and Publication, Quetta, 2023, P. 136- 137
7. Muneer Momoin, Gumshda Samandar ki Aawaaz, Tarjuma, Ahsan Asghar, Aks Publication, Lahore, 2020, P. 57-58
8. Adan Adeem, Lafz Muqadas hotay hain, Alhamd Publications, Lahore, 2006, P. 131-136
9. Danial Tareer, Mani Fani, Maher dar institute of research and Publication, Quetta, 2012. P. 32.
10. Ain Salam, Guher Guher Sitaragi, Qalat Publisher, Quetta, 2011, P. 222.
11. Ghani Pahwal, Sanson ki kashtian, Rang e adab Publication, Karachi, 2019, P. 37
12. Tamseel Hafsa, Faraon Zinda hain (nazm), Matabua: Sangat (Mahnama), Jild 21, Shumara 3, February 2018, P. 48.
13. Beram Ghauri, Najm E Tamheed E Shab, Gauher Ghar Publications, Quetta, 2023, P. 104-105
14. Ahmad Sheheryar, Ik Qadam Aur, Collage Publications, Lahore, 2023, P. 55-56
15. Imran Saqib, Chup ki Chap, Maher dar institute of research and publication, Quetta, 2013, P. 101
16. Nausheen Qambarani, The Axiom of Infinity (Nazm) , Matbua, Sangat, Jild 20, Shumara 11, October 2017, P. Back Title.
17. Attiq Ullah, Aarki Type: Tasawur awr Tanqeed, Mashmola, Tanqeed ki jamaliyat (Jild: 8), Muratab, Professor Attiq Ullah, Fiction House, Lahore, 2018, P. 183



Dr. Qandeel Bader is an Assistant Professor in the Department of Urdu at Sardar Bahadur Khan Women's University, Quetta, Pakistan. She completed her Ph.D. in Urdu from the National University of Modern Languages, Islamabad, with a focus on Poetry and Criticism. Dr. Bader has authored 14 research articles and one poetry book, and she received the prestigious Allama Iqbal Adabi Award in 2022. Her research interests center on poetic expressions in contemporary Urdu literature. Additionally, she holds the position of Chairperson of the Department of Urdu at Sardar Bahadur Khan Women's University, Quetta.